بانو قدسیہ کے ناولوں میں معاشی افکار و مسائل

عابد سلیم
محمد ریاض عابد

Abstract:

A renowned novelist, short story writer and a dramatist Bano Quddasia was born in November 28, 1928 at the city of Ferozepur in the undivided India. She is widely acclaimed in the fiction and drama writing field. Her fiction and dramas are valuable contribution towards the Urdu literature. "Purva", "Aik Din" and "Mom Ki Galiyaan" are her novelettes. In novel writing, she has proved herself as a mature artist through her writing style and content. She has presented social problems in a artistic manner. The problems faced by women and their social status are the striking themes of her novels. She has vehemently commented on economy and its financial problems present in the society. Whether it's " Shehr e Bemisaal", "Raja Gidhh", " Hasil Ghat" or "Shehr e Lazawaal, Abad Weeranay" there are ideological similarities yet her unique style is present everywhere. Pakistan's social and economic problems are a vital reference in her novels.

''شہر بے مثال'' بانو قدسیہ کے ابتدائی دور کے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک ناولٹ ''پروا'' کے عنوان سے لکھ چکی تھیں۔ ''شہر بے مثال'' کا سن اشاعت ڈاکٹر انور سدید نے ۱۹۶۷ء (۱) جبکہ نادیہ جلیل نے اپنے ایم فل کے تحقیقی مقالہ میں ۱۹۶۹ء (۲) لکھا ہے۔ راقم الحروف کے پاس اس ناول کا جو نسخہ موجود ہے اس کے ابتدائی صفحہ پر ناول کا نام تحریر ہے جبکہ اگلے صفحہ پر سن اشاعت ان الفاظ میں درج ہے۔ ''پہلی بار: جولائی ۱۹۷۹ء''۔ ناول کا یہ نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جسے مکتبہ اُردو لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس نسخے میں تقریباً سو صفحات کی ترتیب بھی درست نہیں ہے غالباً پرنٹنگ کے دوران صفحہ نمبر کا اندراج غلط ہو گیا ہے۔

اکہرے پلاٹ کا حامل یہ ناول فکری گہرائی اور قصے کی تہہ داری کی بجائے سادہ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔ فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ مختلف مقامات پر بانو قدسیہ نے حکایتوں کے ذریعے کہانی کو پر تاثیر بنا دیا ہے۔ ان حکایات کی بدولت ناول میں دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ رشیدہ میر جسے اس کی ماں رشو جان کہہ کر پکارتی ہے، مرکزی نسوانی کردار ہے۔ اس کی دوست شکیلہ ڈمپل اور خالہ فیروزہ کے علاوہ طوائف گل نار بھی اہم نسوانی کردار ہیں۔ ظفر ناول کا ہیرو ہے۔ اس کا باپ ملک بختیار علی اور دوست غازی، مرد کرداروں میں نمایاں ہے۔ ''شہر بے مثال'' میں معاشرے میں عورت کو درپیش مسائل، لاہور کی رومان پرور فضا اور سماجی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کے کچھ عمومی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ رشیدہ میر اور ظفر دونوں ایک یونیورسٹی میں نفسیات کے طالب علم ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے نفسیاتی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ جن میں ''ایڈی پس کومپلکس'' سرفہرست ہے۔ اس کی عملی مثال ناول میں ظفر کے باپ ملک بختیار علی کی اپنے بیٹے کی محبت ''رشو جان'' سے شادی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ رشیدہ میر بہاول پور سے لاہور تعلیم کے حصول کے لیے آتی ہے اور یہاں مختلف مسائل کا شکار ہو کر پر آسائش زندگی کے حصول کے لیے ملک بختیار علی سے شادی کر لیتی ہے اگرچہ سکون اس شادی کے بعد بھی ناپید ہے۔ لاہور کی پر رونق سماجی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل ''شہر بے مثال'' کا اہم حوالہ ہیں۔ سماجی و معاشرتی نوعیت کے اس ناول میں معاشی و اقتصادی مسائل اور معاشی پس ماندگی بالواسطہ کہانی کا حصہ بنے ہیں۔ رشیدہ میر متوسط طبقے کی نمائندہ ہے تو اس کی خالہ فیروزہ اور ظفر کا باپ ملک بختیار علی اعلیٰ طبقے کے نمائندہ ہیں جن کی زندگی میں دولت کی فراوانی ہے اور عام آدمی کے مسائل کی انہیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔ مالی لحاظ سے مستحکم اس طبقے کی زندگی میں تفاخر، احساس برتری اور نمود و نمائش کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

> ''عام آدمی کی ایک شہ رگ ہوتی ہے جس سے اس کا لہو جاری و ساری رہتا ہے۔ اس بے مثال شہر کی شہ رگیں بھی دو تھیں، ایک جو لہو کی گردش کے لیے مخصوص تھی اور دوسری وہ جس میں احساس برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی۔ شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے تھے لیکن احساس برتری کے بغیر انہیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار تھا۔'' (۳)

اس مخصوص احساس برتری کی نمائندہ رشیدہ میر کی خالہ فیروزہ ہے۔ جس کے گھر وہ بہاول پور سے آکر سکونت اختیار کرتی ہے۔ خالہ فیروزہ کے روزمرہ کے معمولات اس بات کے غماز ہیں کہ اسے اپنی دولت کی نمائش کا از حد شوق ہے۔ ان کے گھر میں نوکروں کی ریل پیل ہے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے الگ الگ ملازم موجود ہیں۔ خالہ فیروزہ کی ذاتی مصروفیات محض فیشن پرستی، محفل آرائی، شاپنگ، عیش پسندی اور خود نمائی تک محدود ہیں۔

> ''صبح کے وقت خالہ فیروزہ عموماً شاپنگ کرنے نکل جاتی تھیں۔ گھر پر کپڑوں کا انبار ہونے کے باوجود ہر نیا رنگ ہر نیا کپڑا ان کی جان بن جاتا اور اسے چاہے وہ کئی دن نہ خریدتیں پھر بھی ان کی جان پر بنی رہتی۔ بزاز اور درزی کے بعد انہیں جیولرز سے بہت کام رہتے تھے۔ پرانے زیور کی توڑ پھوڑ، نئے زیور کی رتی ماشے تلوانے، موتیوں کو پرکھنے اور جدید زیوروں کو پہن پہن کر آئینے میں دیکھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔'' (۴)

متوسط طبقے کے اقتصادی مسائل اور مالی مشکلات بھی ''شہر بے مثال'' میں موجود ہیں۔ رشو جان جب خالہ فیروزہ کے گھر سے اپنی دوست شکیلہ ڈمپل کے گھر رہائش اختیار کر لیتی ہے تو متوسط طبقے کی زندگی کے نہاں گوشے کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے ان لوگوں میں جب ایک فرد کا اضافہ ہو جاتا ہے جو ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو ڈمپل کے باپ کی تشویش بجا نظر آتی ہے۔

> ''ڈمپل کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہ تھی لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ڈمپل کے ابا جی اسے کھردری نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ جب کبھی وہ اکٹھا کھانا کھاتے، تو ان کی نظریں رشو کی پلیٹ پر جمی رہتیں۔ جتنی مرتبہ وہ سالن کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ اتنی مرتبہ اس کے ابا جی ہولے سے کھانستے۔ جب وہ چھابے میں سے روٹی اٹھاتی تو ابا جی کا اپنا نوالہ جہاں بھی ہوتا لمحہ بھر کے لیے رک جاتا'' (۵)

لاہور میں قیام پذیر متوسط طبقے کی زندگی معاشی عدم استحکام کے اثرات کا اس قدر شکار ہے کہ روزمرہ استعمال کی چیزیں بھی ان لوگوں کو آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں لوگ اپنے بچوں کے اخراجات بھی برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ مہنگائی کی وجہ سے اس طبقے میں اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی سکت ختم ہو رہی ہے۔ جس کی وجہ سے Child Labor کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ ''شہر بے مثال'' میں بانو قدسیہ نے ان حقائق کو ظفر کے والد ملک بختیار علی کے ذریعے بیان کیا ہے۔ رشو جان سے شادی کرنے کا راستہ ہموار کرنے کے لیے وہ اس کا بینک اکاؤنٹ کھلواتے ہیں، اس میں پانچ ہزار روپے رکھواتے ہیں اور اسے ڈمپل کے خاندان پر بوجھ بننے سے روکتے ہوئے ان اقتصادی مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس شہر بے مثال یعنی لاہور میں متوسط طبقے کے ہر فرد کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ''لاہور ایک معروف شہر ہے، مہنگا شہر ہے، یہاں کوئی کسی کے اخراجات برداشت کر کے خوش نہیں رہ سکتا۔'' (۶)

۲۔ ویسے لاہور میں تو اپنے رشتہ دار چھوڑ اپنے بچوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ہائے اللہ کیسا شہر ہے؟ جہاں اپنے بچوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔'' (۷)

معاشی پس ماندگی کے اثرات میں کرپشن سر فہرست ہے۔ مالی مشکلات پر قابو پانے کے لیے یہ ایک ایسا شارٹ کٹ راستہ ہے کہ مہنگائی اور اخراجات کے باوجود اس کے ذریعے انسان معاشی مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ ''شہر بے مثال'' میں بانو قدسیہ نے لاہور میں کرپشن کی ابتداء کے سراغ ڈھونڈتے ہوئے اسے مہاراجہ رام چندر کے دور میں جا تلاش کیا ہے۔

''کرپشن کا محکمہ لاہور میں بہت پرانا تھا۔ مہاراجہ رام چندر کے سپوت لوہو نے جب لاہور کی بستی بسائی اور سورج بنسی راجاؤں کا نام اس شہر کے ساتھ جوڑ کر امر کیا تو خود راجہ لوہو کے پتا مہاراجہ رام چندر کی سروس بک پر کرپشن کا دھبہ لگ چکا تھا۔''(۸)

رشو جان کے خالو جمال اظہر بخاری کے ذریعے بانو قدسیہ نے لاہور میں کرپشن کا تذکرہ کیا ہے۔ پی سی ایس کرنے والے جمال خالو ایک ایمان دار آفیسر ہیں جو انٹی کرپشن کے محکمہ میں ملازم ہیں۔ کسی قسم

کی کوئی سفارش اور دباؤ ان سے غلط کام کو درست نہیں کروا سکتا۔ کرپشن پر اظہار خیال کرتے ہوئے بانو قدسیہ لکھتی ہیں۔

> ''کرپشن کے بھی ازل سے کئی روپ ہیں اور اس کے ہر روپ کا فلسفہ بھی ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے۔ فلسفہ چاہے کچھ بھی ہو، تھیوری چاہے کچھ بھی کہے، اتنی بات ضرور طے ہے کہ ہر عہد میں کرپشن آفیسر سے صاف گوئی کی توقع کی جاتی رہی ہے۔'' (۹)

کرپشن کا دوسرا روپ ناجائز کو جائز اور غلط کو صحیح بنانے کا ہے۔ اس ناول میں کرپشن کا یہ روپ غازی کے والد ملک نیاز محمد کے ذریعے بیان ہوا ہے۔ ملک نیاز محمد ایک بڑے زمین دار ہیں۔ رشوت اور دیگر حربوں کے ذریعے زمین کے ملکیتی حقوق حاصل کر کے انہوں نے ساٹھ مربعے حاصل کئے ہیں۔

> ''غازی کے ابا جھنگ کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کی جاگیر تقریباً ساٹھ مربعوں پر مشتمل تھی جو زرعی اصلاحات ہونے کے بعد انہوں نے گھر کے مختلف افراد کے نام بیع کر کے مختار نامے، عام اور خاص حاصل کر لئے تھے۔ اس زمین کے شکمی اجارہ داروں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ شاید ان کے رجسٹر میں بھی درج نہ تھی۔ دروغ حلفی اٹھانے کے ماہر، دعویٰ زائد المیعاد کے مقدموں کی پیروی میں گرفتار، شاملات میں دخل کاری کے ماہر، جھوٹے تملیک ناموں کے پیچھے مرنے والوں، مزارعوں کی تقاوی کو ترکہ پدری سمجھنے والے، تعزیراتِ ہند کے حافظ تھے۔ ان کا سارا وقت ایسے بکھیڑوں میں گزرتا تھا۔'' (۱۰)

بانو قدسیہ نے اس ناول میں لاہور کی سماجی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں سے ایک گوشہ طوائف کی زندگی اور اس کے معاشرتی مسائل کا ہے۔ جسے گل نار کے ذریعے کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ گل نار اور رشو جان یعنی رشیدہ میر کے ذریعے عورتوں کے سماجی مسائل تانیثی نقطۂ نظر سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ''شہر بے مثال'' بانو قدسیہ کے ابتدائی دور کا ناول ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ''راجہ گدھ''، ''حاصل گھاٹ'' اور ''شہر لازوال، آباد ویرانے'' کی موجودگی میں بانو کا یہ ناول فنی اور فکری سطح پر دوسرے درجے کا ناول قرار پاتا ہے۔

''راجہ گدھ'' بانو قدسیہ کا نمائندہ ناول ہے۔ ادب کی دنیا میں یہی ناول اُن کی پہچان ہے۔ ''راجہ گدھ'' پہلی دفعہ ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ناول کا بنیادی موضوع حلال اور حرام رزق کے انسانی زندگی پر اثرات سے عبارت ہے۔ ناول کے موضوع پر بات کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے ایک انٹرویو میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> ''سوال: جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ''راجہ گدھ'' کا مرکزی خیال رزق حلال کے اسلامی تصور سے عبارت ہے۔ انفرادی سطح پر فرد اور اجتماعی سطح پر معاشرہ اخلاقی اور روحانی زوال سے اس لیے دوچار ہے کہ رزق حرام کو فروغ مل رہا ہے۔
>
> بانو قدسیہ: جی ہاں اس ناول کا بنیادی خیال یہی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اپنے ناول میں یہی کہنا چاہا ہے کہ اگر ہم مغرب کے اثرات سے نکل کر رزق حلال کے عادی ہو جائیں تو صرف اسی ایک تبدیلی کے زیر اثر ہماری معاشرتی زندگی سے تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔'' (۱۱)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان ''راجہ گدھ'' کو ''نظریاتی کمٹ منٹ کا ناول'' (۱۲) قرار دیتے ہیں جبکہ نیلم فرزانہ کا کہنا ہے کہ ناول کا بنیادی موضوع ''جدید مادی معاشرے میں فرد کی تنہائی'' (۱۳) سے عبارت ہے۔ رضوان اللہ آروی ''راجہ گدھ'' میں پیش کردہ رزق حرام اور حلال کے فلسفے کو پاکستانی سماج کے تناظر میں دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''بانو قدسیہ ''راجہ گدھ'' لکھ کر اُردو ادب میں زندہ جاوید بن گئی ہیں۔۔۔۔ اس میں انہوں نے ''رزق حرام'' جیسے سلگتے ہوئے مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے موجودہ دورِ رشوت ستانی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ناول بڑا اہم اور برموقع نظر آتا ہے۔'' (۱۴)

ناول کے مرکزی کرداروں میں قیوم، آفتاب، سیمی شاہ، پروفیسر سہیل، امتل، عابدہ اور روشن شامل ہیں۔ ناول کیونکہ پوری زندگی سے عبارت ہوتا ہے اس لیے ''راجہ گدھ'' میں بھی صرف حرام اور حلال کے تصور سے ہی بحث نہیں کی گئی بلکہ اس میں ہمیں پاکستانی معاشرہ اور اس کے تضادات بھی نظر آتے ہیں۔۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کے معاشرے کی صورت حال، دیہی زندگی اور عوام کی پس ماندگی،

طوائف کی حالت زار، لوگوں کی مالی پریشانیاں اور نمودو نمائش، اشرافیہ کی زندگی اور تصوف کے عناصر اس ناول میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ سیمی شاہ کا والد ایک بیوروکریٹ ہے مگر وہ اپنی زندگی میں مالی اور سماجی سطح پر ایک بلند مقام چاہتا ہے۔ جس کے حصول میں وہ اس قدر مگن ہے کہ اسے اپنی اولاد کی بھی پروا نہیں ہے۔ اس کے نزدیک دولت اور اپنی ساکھ ہی سب کچھ ہے۔ معاشرتی تضاد کی ایک مثال پروفیسر تنویر کی ہے۔ قیوم بی۔ اے میں پروفیسر تنویر سے پڑھتا تھا۔ ان کی شخصیت کے تضاد کو بیان کرتے ہوئے قیوم بتاتا ہے۔

> ''وہ ایک سوشلسٹ تھے۔ تھیوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مصیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کرتے۔۔۔۔۔ وہ دل سے سوشلسٹ تھے لیکن صرف کتابی طور پر ان کا رہنا سہنا، ملنا ملانا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کی سی تھیں۔ مشکل یہ تھی وہ نہ اپنے سوشلسٹ نظریے پر تنقید برداشت کرتے تھے نہ اپنی طرز زندگی پر'' (۱۵)

ڈاکٹر انور سدید ان معاشرتی تضادات کی وجہ سے اس ناول کو ایک ''کھوکھلے معاشرے کا ناول''(۱۶) قرار دیتے ہیں۔ قیوم چندرا نامی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس گاؤں کے ذریعے بانو قدسیہ نے اپنے اس ناول میں دیہی سماج اور اس کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ایک سیم زدہ گاؤں ہے جو آخر کار سیم کی زد میں آکر برباد ہو جاتا ہے۔ اس گاؤں کا ایک اہم کردار عزیز گاتن اور اس کی ماں ماسی الفت ہے، ماسی الفت اپنی غریبی مٹانے اور بیٹے کی خوشی کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے اتنی دولت اکٹھا کرنا چاہتی ہے کہ وہ آرام سے زندگی بسر کرسکے۔ ماسی الفت تنور پر روٹیاں لگا کر گزارہ کرتی ہے۔ اس کے کردار کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

> ''ماسی الفت کی بہت بکری تھی۔ اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی۔ اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔'' (۱۷)

ناول کے آخری حصہ میں امتل کے کردار کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں طوائف کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امتل جب جوان تھی تو ریڈیو اسٹیشن سمیت اس

کی ہر جگہ مانگ تھی مگر عمر ڈھل جانے کے بعد اسے کوئی پوچھتا نہیں اور وہ اس امید پر ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتی رہتی ہے کہ شاید کوئی چھوٹا موٹا پروگرام مل جائے تو جو پیسے ملیں گے ان سے کچھ دن سکون سے گزر جائیں مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ معاشرے میں موجود طبقاتی تفاوت کو وہ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کرتی ہے۔

> ''لئو سرجی اونچ نیچ کا چکر کہاں نہیں۔۔۔۔ چوروں میں اس کا چکر، سمگلروں میں اس کا چکر۔ کچھ چور تو صرف نقدی سونا چرانے والے ہوتے ہیں۔ کچھ بھینس بکری کھول کر لے جاتے ہیں۔ کچھ صرف گٹروں کے ڈھکن اٹھاتے ہیں۔''(۱۸)

''راجہ گدھ''میں پرندے بھی اپنی جگہ ایک مضبوط کردار ہیں۔ ان کی مختلف کانفرنسوں میں ہونے والی گفتگو فکری سطح پر بڑی معنی خیز اور علامتی ہے۔ ان کے ذریعے انسان پر حرام رزق کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے جس میں سب سے خطرناک دیوانگی اور پاگل پن ہے۔ انسان دوسروں کا حق غصب کر کے سب کچھ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے اور دوسروں سے امیر ہونے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ حرام رزق نے انسان پر اس قدر منفی اثرات مرتب کئے ہیں کہ اب یہ اس کے خمیر کا حصہ بن چکا ہے ۔ چیل، سیمرغ کے سامنے راجہ گدھ اور انسان پر رزق حرام کے اثرات کا تقابل کرتے ہوئے کہتی ہے کہ راجہ گدھ نے حرام رزق کا تصور انسان سے لیا ہے کیونکہ

> ''انسان حیلہ جوئی اور مکر سے کماتا ہے، بھائی کا حق غصب کرتا ہے۔ اپنوں کی دشمنی میں غیروں سے مل کر کماتا ہے۔ صلہ رحمی کا خیال نہیں کرتا۔ ہر آنے والے مال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر کھاتا ہے۔ جو کھا نہیں سکتا اسے کتے کی طرح چھپا کر رکھ چھوڑتا ہے۔ حرام روزی کے انسان کو اتنے گر آتے ہیں جتنے گھونسلے بنانے کے طریقے ہمیں یاد ہیں۔'' (۱۹)

''راجہ گدھ'' میں معاشرے کے اقتصادی مسائل اور معاشی عدم استحکام کے اثرات اس انداز میں بیان نہیں ہوئے جیسے ''شہر بے مثال'' میں ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کہ ناول کا موضوع اور مرکزی خیال اس بات پر زور دیتا ہے کہ حرام رزق نہ صرف خود انسان بلکہ اس کی آنے والی نسلوں پر بھی منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس طرح ناول اپنے باطن میں رزق حلال کھانے

اور کھلانے کی ترغیب لئے ہوئے ہے۔ پاکستان کے مخصوص پس منظر میں دیکھا جائے، جس کی طرف رضوان اللہ آروی اشارہ کر چکے ہیں، تو رشوت اور کرپشن کے رسیا اس معاشرے کے لیے یہ ناول ایک نشان منزل بن جاتا ہے۔ یہ ہمیں ایک اخلاقی سبق بھی دیتا ہے کہ معاشی استحکام کی طرف جانے والا ہر وہ راستہ جو رشوت کے چور دروازے سے ہو کر گزرتا ہے آنے والی نسلوں کے لیے تباہی بنتا ہے۔

بانو قدسیہ کا ناول "حاصل گھاٹ" ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا یہ ناول اپنے اندر کہانی پن سے زیادہ فلسفہ لئے ہوئے ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ہمایوں فرید ہے۔ وہ امریکہ میں اپنی بیٹی کے پاس رہائش پذیر ہے اور اس کے گھر کی بالکونی میں بیٹھا اپنے ماضی کو کرید رہا ہے۔ ماضی کی اسی کرید سے واقعات کا تانا بانا بُنا گیا ہے اور فلسفیانہ انداز میں بانو نے اپنے خیالات کا اظہار ہے۔ ہمایوں فرید دراصل خود بانو قدسیہ کا ترجمان ہے۔ ناول کے دیگر کرداروں میں ہمایوں فرید کی بیوی اصغری، بیٹی ارجمند، بیٹا جہانگیر، بہو شاہدہ اور داماد بلال شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اقبال کا کردار بھی اہم ہے جس سے ہمایوں فرید جوانی میں محبت کرتا تھا مگر اس کی شادی نثار احمد صدیقی سے ہو گئی۔ بڑھاپے میں جب امریکہ میں قیام کے دوران ہمایوں فرید کی ملاقات اقبال سے ہوتی ہے تو اسے اپنی جوانی کے جذباتی دنوں کی یاد پھر ستانے لگتی ہے۔ "حاصل گھاٹ" میں مغربی تہذیب پر تنقید بھی ملتی ہے، پاکستان اور امریکہ کے تقابل سے مشرق اور مغرب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے اور ان احساسات و جذبات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو والدین صرف اس وقت محسوس کرتے ہیں جب ان کی اولاد انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر بیرون ملک چلی جائے۔ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ بانو قدسیہ کا اپنا مخصوص فلسفہ اور نقطۂ نظر بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے جس کا نمایاں پہلو عہد جدید میں بھی مشرق کی رفعت و عظمت پر مشتمل ہے۔ "حاصل گھاٹ" کے موضوع کے حوالے سے شائسہ فاخری اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں۔

> "بانو قدسیہ کی یہ تخلیق "حاصل گھاٹ" انسانی ذہن کے پیچیدہ خیالات کا اظہار بھی ہے اور جدید معاشرے کی وہ تصویر بھی ہے جو انسان کو اس طرف کھینچ رہی ہے، جو راہ مشرق سے مغرب کی جانب جاتی ہے اور جہاں ایک نئی صدی کا فیوژن ہو رہا ہے۔ یہ ناول جدید عہد میں پیدا ہونے والے معاشرتی اور فکری مسائل کو پیش کرتا ہے۔" (۲۰)

فلسفیانہ مزاج کے حامل اس ناول میں اقدار، فلسفہ، فکری اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں ہلکی سی جھلک انسان کے اقتصادی مسائل کی بھی مل جاتی ہے۔ ہمایوں فرید کی معاش کا ذریعہ لاہور کے ہال روڈ پر الیکٹرونکس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ وہ مسلسل محنت کے ذریعے الیکٹرونکس کی درآمدات اور برآمدات کا کاروبار کرتا ہے اور بہت جلد ساندہ جیسے پسماندہ علاقے سے ڈیفنس منتقل ہو جاتا ہے۔ معاشی پس ماندگی کے اثرات کے حوالے سے اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں سب سے پہلے تلاش رزق سے زیادہ حصول دولت کے لیے نوجوان طبقے کا امریکہ کی طرف سفر کرنا نظر آتا ہے۔ جسے معاشیات کی اصطلاح میں Brain Drain کہا جاتا ہے، ناول کے مرکزی کردار ہمایوں فرید کا اکلوتا بیٹا جہانگیر اور بعد میں اس کی بیٹی اور داماد بھی مستقل بنیادوں پر امریکہ چلے جاتے ہیں تاکہ پر آسائش زندگی گزار سکیں۔ ہمایوں فرید بالکونی میں بیٹھا اس بات پر بھی غور کرتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے پاکستان اور سارے تھرڈ ورلڈ کا سماجی، معاشرتی اور معاشی نظام مستقل بنیادوں پر چلنے نہیں پاتا۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ رشوت، سفارش اور دھاندلی کے اثرات نے ہماری زندگی پر اس قدر غلبہ پالیا ہے کہ اب ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی ہے، بانو قدسیہ مشرق اور مغرب یعنی پاکستان اور امریکہ کی معاشی اقدار کا موازنہ کرنے کے بعد برملا کہتی ہیں کہ پاکستان میں لوگ وقت نہیں بلکہ روپے بچاتے ہیں دوسری طرف صورت حال اس کے برعکس ہے۔

> ”امریکہ میں لوگ ڈالر نہیں بچاتے، وقت بچاتے ہیں۔ پھر جب وقت کا صحیح مصرف ہونے لگتا ہے تو ڈالر خود ہی پس انداز ہونے لگتے ہیں۔“ (۲۱)

اس طرز عمل کے منفی پہلو اجاگر کرتے ہوئے بانو قدسیہ اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ امریکیوں کے اس طرز عمل کی وجہ سے ایک خاص قسم کی اکتاہٹ اور بے چینی ان کو گھیر لیتی ہے اور وہ جتنی زیادہ دولت جمع کرتے ہیں اتنا ہی نمود و نمائش کا عنصر ان کی زندگیوں میں سرایت کر جاتا ہے۔

> ”دولت اپنی مشغولیات خود بڑھاتی ہے۔ محل نما گھر ان گھروں کے انتظام، بیرونی ممالک کے سفر، Designer کپڑوں اور جوتوں کی تلاش، دولت کی بناء پر شہرت کی ہوس۔۔۔۔۔۔۔ڈالر بچنے لگتے ہیں تو پھر ایک اور قسم کا Stress شروع ہو جاتا ہے۔ دراصل یہاں وہاں انسان پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نکلے۔ اسے

طمانیت قلب، سکون اور شانتی ملے۔ لیکن شاید معیشت اور معاشیات کو یہ کچھ درکار نہیں۔(۲۲)

''حاصل گھاٹ'' میں معاشیات کے بنیادی اصول اور مباحث پر بھی تبصرہ ملتا ہے مگر ان اصولوں پر بات کرتے ہوئے بانو قدسیہ کا لہجہ بہت طنزیہ ہے۔ اس طنز میں اصلاح کا پہلو بھی جلوہ گر ہے کہ آخر اس قدر دولت اکٹھی کر کے اور دوسروں پر اپنی دولت کا رعب ڈال کر انسان کو اخلاقی یا روحانی طور پر حاصل کیا ہوتا ہے۔ ان سوالوں کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔

اس ناول میں ہجرت کر کے آنے والوں کے مسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور جعلی کلیم دائر کر کے راتوں رات امیر ہونے کی کہانیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ ہجرت کرنے والوں کے مصائب و آلام کبھی بھی کم نہیں ہوئے بھلے وہ ہجرت ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد کی ہو یا اکیسویں صدی میں روزگار کی تلاش میں بیرون ملک کی جانے والی ہجرت بہر حال انسان کو مصائب کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ بانو قدسیہ نے ان تارکین وطن کو مختلف قسموں میں تقسیم کر کے بڑے طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہمایوں فرید کے دادا کے مختصر کردار کے ذریعے مشترکہ ہندوسانی تہذیب کے چند نمایاں پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح بلال اور ارجمند کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ مغربی معاشرے میں عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا پڑتا ہے تب جا کر معاشی حالات میں کچھ سدھار آتا ہے۔ فلسفیانہ اندازِ بیان کی وجہ سے اکثر مقامات پر عام قاری پر اس ناول کی تفہیم نہیں ہو پاتی۔ مشرق اور مغرب کی اقدار اور معاشرتی تفاوت کو بیان کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے دونوں تہذیبوں کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کر کے نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ بانو قدسیہ کا رجحان مشرقی اقدار کی برتری کی طرف ہے۔ ''حاصل گھاٹ'' میں اگرچہ معاشی عدم استحکام کے اثرات یا اکیسویں صدی میں پاکستان کی معاشی صورت حال کے نقوش تو نہیں ملتے مگر معاشیات کے بنیادی مباحث کا تذکرہ اس ناول کا اہم حوالہ ہے۔

بانو قدسیہ کا آخری اُردو ناول ''شہر لازوال، آباد ویرانے'' ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک وسیع کینوس کا حامل ناول ہے۔ جو مختلف زمانوں میں لاہور کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ناول میں لاہور کی تاریخ، مختلف ذاتوں خصوصاً راجپوتوں کی قدیم تہذیب، تاریخ، مشترکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت، مسلمانوں کا ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ سماجی و سیاسی تعلق، تحریک پاکستان، قیام

پاکستان، ہجرت اور فسادات، پاکستان کے قیام کے بعد کے مسائل اور پھر جنرل ایوب اور یحییٰ خان کے دور حکومت میں وطن عزیز کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تانیثی رجحان کے تحت عورتوں کے مسائل اور مصائب کا تذکرہ ناول میں موجود ہے۔ رخشندہ یعنی رشو طوائف اور راحیلہ کے ذریعے مختلف ادوار میں عورتوں کے مصائب و مشکلات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرد کرداروں میں رشو کا خاوند ظفر، سید اکرام شاہ، کاشف، جنرل بختیار اور اس کا بیٹا جمال، ڈاکٹر سرفراز، شوکت، قیصر، شاہد اور نجم وغیرہ شامل ہیں۔ بڑی تقطیع کے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل اس ناول کا بنیادی موضوع مختلف ادوار میں لاہور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تاریخ ہے مگر کہیں کہیں معاشی مسائل اور غربت، رشوت اور طبقاتی تقسیم کے مضر اثرات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

ناول کے آغاز میں رخشندہ اور سید اکرام شاہ کے کردار سامنے آتے ہیں۔ سید اکرام شاہ کی دعوت پر رشو طوائف یعنی رخشندہ ایک دن کے لیے لاہور سے جھنگ گئی تھی۔ اس سفر کا مقصد اکرام شاہ اور اس کے مہمانوں جن میں جاگیر دار اور بیوروکریٹ شامل ہیں کا دل لبھانا تھا۔ سید اکرام شاہ کے تعارف سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قبیل کا آدمی ہے۔

> ”سید اکرام شاہ جھنگ کی ان زوردار ہستیوں میں سے تھے جن کے ہاں علاقے کے تمام افسر چوکی بھرنے آتے تھے۔ کچھ رشوتوں کی گرم بازاری، کچھ گفتگو کا مسکا، کچھ Good Time کے بندھن ایسے تھے کہ سبھی ان کی بات کو سولہ آنے سمجھتے تھے۔“ (۲۳)

پاکستان میں حصولِ زر کی نا ختم ہونے والی دوڑ اور زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کو بانو قدسیہ نے بڑے طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک جائز اور ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کے بعد اسے چھپا چھپا کر رکھنا معیوب ہی نہیں بلکہ اخلاقی زوال پذیری کا بین ثبوت ہے۔ انہوں نے عورت اور روپے کے اشتراکات کا تذکرہ کرتے ہوئے پاکستان میں عورت کی مظلومیت اور روپے کی چوری پر بھرپور طنز کیا ہے۔

> ”پاکستان میں روپیہ عورت کی طرح پردے دار باحیا ہو گیا تھا۔ لاکرز میں بند، بیرونی ممالک میں چھپا ہوا، سونے چاندی کی شکل میں مقید روپیہ اپنی موت آپ مر رہا تھا

۔۔۔۔۔۔۔روپے نے عورت کے ساتھ اپنا رول بدل لیا تھا اور دونوں معجوب تھے۔
روپے اور عورت کا کوئی مرکز، کوئی حدود اربعہ، کوئی جہت باقی نہ رہی تھی۔"(۲۴)

پاکستان میں "منی لانڈرنگ" کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں اس اقتباس کو دیکھا جائے تو اس کی تفہیم اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ بڑے برے افسران سے لے کر معمولی سرکاری عہدہ داران کے گھروں سے ملنے والے کروڑوں مالیت کے زیورات اور نقد رقم اور بیرون ملک چھپائی گئی دولت جیسے جرائم کی پاداش میں جیلوں میں پڑے سیاست دان اور سپریم کورٹ میں پیشیاں بھگتتے افسران پر کیا گیا طنز کسی سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ ایسے معاشرے بانو قدسیہ کے بقول کسی بڑے انتشار کی زد میں ضرور آتے ہیں۔ ناول میں جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ اس نے ملک میں صنعتی اور زرعی انقلاب کے نام پر پورے ملک کو صرف بائیس خاندانوں کے حوالے کر کے ملک کی معیشت، صنعت اور زراعت کو چند ہاتھوں تک محدود کر دیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد رخشندہ کی ملاقات جنرل بختیار سے ہوتی ہے (تب وہ کرنل تھا)۔ اس وقت فوجی وردی میں ملبوس افراد رخشندہ کے لیے بہت محترم اور قابل توجہ تھے۔ جنرل بختیار سے تعلقات کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو جنرل اسے Abortion کروانے کے لیے ڈاکٹر فہیم کی بیوی کے پاس لے جاتا ہے جو خود بھی ڈاکٹر ہے۔ رشونہ چاہتے ہوئے بھی اپنا بچہ ضائع کروا دیتی ہے۔ پاکستان میں طبقاتی تقسیم کے حوالے سے بھی ناول کے ابتدائی حصے میں دلچسپ مباحث موجود ہیں۔ معاشی عدم استحکام غریب کو غریب تر کرتا چلا جاتا ہے تو امیر کی دولت بھی دن رات بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ معاشرہ طبقات میں بٹتا چلا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک یہ دولت ہی ہے جو معاشرے کو امیر اور غریب کے طبقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جاگیر دار اور سرمایہ دار کے استحصال ہی کی وجہ سے کسان اور مزدور وجود میں آتے ہیں۔ "شہر لازوال، آباد ویرانے" میں طبقاتی تفاوت کئی مقامات پر موضوع بنا ہے۔

"جب تک بورژوا Petty ہوتا ہے Capitalistic نظام باقی رہتا ہے۔"(۲۵)

پاکستان میں موجود امیر طبقے کی روزمرہ زندگی اور ان کے سوچنے کے انداز کو رخشندہ کے ذریعے کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ وہ پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والوں کی خدمات کے متعلق سوچتی ہے اور پھر اس امیر طبقے کی روزمرہ زندگی کے معمولات پر بھی غور کرتی ہے۔ جنہیں پاکستان سے اگر کوئی سروکار ہے

بھی تو بس اتنا کہ وہ اس ملک میں رہتے ہوئے عوام کو لوٹ کر زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لیں۔ ان کا حال یہ ہے:

> ”یہ لوگ نیشنل ہوئے بغیر انٹر نیشنل قسم کی ہمدردیاں رکھتے تھے۔۔۔۔۔ یہ لوگ فیوڈل لارڈ تھے یا بیوروکریٹ برادری کے اہم رکن یا سیاست کی بساط کے کہنہ مشق مہرے۔ ان سب کی Specific Heat ایک سی تھی۔ ان سب کا Boiling Pointاور Freezing Point ایک سا تھا۔ ان سب کی اگر Chemical Equation لکھی جاتی تو ایک ہی طور پر لکھی جاتی کیونکہ یہ سب جب دولت، فراوانی، علم، فراست، زیبائش و آرائش، تن آسانی کی گرمی میں پرورش پا کر باہر نکلتے تو ان کی شکلیں پی آئی اےShavers سے مشابہ ہو جاتیں اور ان سے قوم ہود، قوم ثمود، حضرت لوط کے گم گردۂ راہ اور بنی اسرائیل کے کج بحثوں کی سی خوشبو آتی۔“ (۲۶)

بانو قدسیہ نے اپنے اس آخری اُردو ناول میں قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی سماجی و سیاسی صورت حال کو بھی کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے یہ بحث عام تھی کہ یہ چھوٹا سا ملک اگر معرض وجود میں آ بھی گیا تو اس کی معاشی حالت اسے کتنے دن برقرار رکھ پائے گی؟ معیشت انتہائی کمزور ہو گی اور معاشی و مالی ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے اس کی اقتصادی حالت ناقابل یقین حد تک کمزور ہو گی ایسے حالات میں اس ملک کا قائم رہنا ناممکنات میں سے ہو گا۔ راحیلہ کے کالج میں بھی آئے دن ایسے مباحث ہوتے رہتے تھے۔ لڑکیاں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کی معاشی حالت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> ”پاکستان ایک چھوٹا ملک ہو گاEconomic Resources کافی نہیں ہوں گے۔ یہ قرضوں پر زندہ رہے گا۔۔۔“ تم ہمارے مطالبے سے اس لیے ڈرتے ہو مونیکا کہ تمہیں علم ہے کہ پاکستان ہی ایسا واحد ملک ہو گا جو Self Sufficient ہو گا۔ پٹ سن، روئی، گندم یہی تو وہ Essentials of Life ہیں۔۔۔۔ جو صرف ہمارے خطے میں ہو گی۔۔۔۔۔ جس ملک کی گرین بیلٹ پیچھے موجود ہو اسے کیا غم“ (۲۷)

''شہر لازوال، آباد ویرانے''میں قیام پاکستان کے بعد ہجرت، فسادات اور نومولود ریاست میں مہاجرین کی آبادی کاری کے مسائل کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مہاجر کیمپوں میں بے یارومددگار افراد کی حالت زار کی بری مؤثر تصویر کشی کی گئی ہے۔ غربت، بھوک، افلاس، بیماری اور کسمپرسی کے ان دنوں میں بھی انسان کی جنسی بھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ والٹن کیمپ میں راحیلہ کو نشہ آور مشروب پلا کر زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ ارسلان کو جنم دیتی ہے۔ افراتفری کے اس دور میں ڈاکٹر قیصر خیر کی علامت بن کر سامنے آتا ہے وہ نہ صرف راحیلہ کو پناہ دیتا ہے بلکہ اس سے شادی کر کے اس کے پیدا ہونے والے بچے کو اپنا نام بھی دیتا ہے۔ جھوٹے کلیم اور جعلی الاٹ منٹس کا سلسلہ ایسا بھیانک تھا کہ اس نے کئی حق داروں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کے معاشرے کے مسائل میں رشوت اور ذخیرہ اندوزی سر فہرست تھے۔ ہر شخص اسی چکر میں تھا کہ جیسے بھی بن پڑے وہ مالی مشکلات سے نکل کر آسودہ زندگی گزارے۔ شوکت مغل کے ذریعے قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد کی معاشرتی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

> ''یونین کے چکر، لیبر لاز کی گرفتیں، رشوت لینے اور دینے کی شرمناکیاں، بلاوجہ قیمتیں بڑھانے کی لت، مارکیٹ کی اڑچنیں، بینک کے قرضوں کی Evasion اور اس کو ادا کرنے کا متزلزل ارادہ، ٹیکس کی زیادتی اور اس کی ادائیگی کے راؤنڈ اباؤٹ طریقے، گھر کا ٹھنڈا یخ ماحول، بیوی اور اس کے درمیان دوری اور فاصلے، نئے وطن میں دوستوں کی کمی اور سوشل لائف کی زیادتی، ان گنت مسائل میں گھر کر شوکت مغل کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ روز مسائل کی فوج یاجوج ماجوج کی طرح بڑھتی، دیوار چین کی طرح ابھرتی اور سارا دن اسے ڈھانے میں صرف ہو جاتا۔''(۲۸)

اس ناول میں بانو قدسیہ نے تاریخ اور تصوف کی چاشنی سے لاہور کی سیاسی و سماجی زندگی کو اپنے مخصوص انداز میں فکشن کا رنگ دیا ہے۔ ان کے ناولوں میں پاکستان کی معاشی صورت حال اور اس سے متعلقہ مسائل زیریں سطح پر موجود تو ہیں مگر ان ناولوں کا بنیادی موضوع سماجی، سیاسی اور تاریخی حالات کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور معاشرتی مصائب ہیں۔

''شہر بے مثال'' سے شروع ہونے والا ناول نگاری کا یہ سفر ''شہر لازوال'' پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنی تمام عمر (قیام پاکستان کے بعد) لاہور میں گزار دی اس لیے لاہور ان کے ہر ناول میں ایک کردار کی صورت میں موجود ہے۔ شہر لازوال آباد ویرانے'' کو فکری سطح پر ''شہر بے مثال'' کی توسیع قرار دینا غلط نہ ہو گا کیونکہ ''شہر بے مثال'' کی رشیدہ میر اور ''شہر لازوال آباد ویرانے'' کی رخشندہ ہے تو ''رشو'' ہی، وہی تانیثی نقطہ نظر، پاکستانی معاشرے میں عورت کے مسائل، مظلومیت اور لاہور شہر خود ایک کردار بن کر اپنی کہانی سناتا نظر آتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ''شہر لازوال آباد ویرانے'' بڑے کینوس کا ناول ہے۔ ''حاصل گھاٹ'' ہو یا ''راجہ گدھ''، شہر بے مثال'' ہو یا ''شہر لازوال، آباد ویرانے'' فکری مماثلتوں کے ساتھ ساتھ بانو قدسیہ کا انفرادی رنگ ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستانی سماج کے سماجی اور معاشی مسائل ان کے تمام ناولوں میں بھرپور انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

حواشی:

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''بانو قدسیہ: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد :اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۰۴

۲۔ نادیہ جلیل، ''بانو قدسیہ کے ناولوں میں اقدار کی شکست و ریخت کا تحقیقی مطالعہ''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، مملوکہ، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۳

۳۔ بانو قدسیہ، ''شہر بے مثال''، (لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۷۹ء)، ص ۲۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۱-۱۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۹۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۶

۸۔ ایضاً، ص ۵۱

۹۔ ایضاً، ص ۵۱-۵۰

۱۰۔ ایضاً، ص۱۰۱

۱۱۔ طاہر مسعود، ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''، (کراچی: مکتبہ تخلیق ادب، ۱۹۸۵ء)، ص۲۸۸

۱۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ، ۲۰۰۷ء)، ص۱۹۴

۱۳۔ نیلم فرزانہ، ''اُردو ادب کی خواتین ناول نگار''، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص۳۱۱

۱۴۔ رضوان اللہ آروی، ''اُردو میں ناول نگاری کی روایت''، مشمولہ سہ ماہی ''ادیب''، جلد ۱۷، شمارہ ۴-۳ (جولائی تا دسمبر)، ۱۹۹۳ء، ص۲۰۴

۱۵۔ بانو قدسیہ، ''راجہ گدھ''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص۱۹-۱۸

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''بانو قدسیہ: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء)، ص۱۲۲-۱۲

۱۷۔ بانو قدسیہ، ''راجہ گدھ''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص۱۵۳

۱۸۔ ایضاً، ص۳۱۶

۱۹۔ ایضاً، ص۲۸۹

۲۰۔ شائستہ فاخری، ''ہندو پاک: خواتین ناول نگار''، مشمولہ، سہ ماہی '' فکر و تحقیق''، جلد ۱۹، شمارہ ۲، اپریل تا جون، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۱۷ء)، ص۱۶۳

۲۱۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص۳۲

۲۲۔ ایضاً، ص۳۲

۲۳۔ بانو قدسیہ، ''شہر لازوال، آباد ویرانے''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص۱۵

۲۴۔ ایضاً، ص۱۶

۲۵۔ ایضاً، ص۳۲

۲۶۔ ایضاً، ص۴۴

۲۷۔ ایضاً، ص۲۱۵

۲۸۔ ایضاً، ص۳۷۰